"موت... مجھے تمہارے قریب لے آئی ہے... ڈیتھ!"

کسی بھی ایک موت کا ایک مخصوص طے شدہ ماحول ہوتا ہے.. عمر رسیدہ' کچی' ناگہانی' حادثاتی' بے وجہ... کسی بھی موت کا... زمین کی پہلی موت پر جب کوّے اترے تھے' چونچ سے مٹی کھود کر تدفین کی بھارت سلجھاتے تھے' تب سے اب تک لمحۂ موجود کی آخری موت تک.. وہی ایک مخصوص طے شدہ ماحول ہوتا ہے..

بُو ہوتی ہے۔

اگر یہ موت ایک چار دیواری' ایک کمرے کے اندر' ایک چارپائی پر ہوتی ہے جس کا بان درمیان میں سے ڈھیلا پڑ چکا ہوتا ہے اور بوجھ کو ظاہر کرتا ہے کہ مرگ وزن بڑھا دیتی ہے بے جان بدن کو بھاری کر دیتی ہے اور اسے کندھا دینے والے ہمیشہ محسوس کرتے ہیں کہ جب وہ سانس لیتا تھا تو اتنا بھاری ہرگز نہ تھا.. تو اس ایک کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک ٹھنڈی' نتھنے جس سے آشنا نہیں ہوتے' ایک ناگوار بُو ہوتی ہے' جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ بدن کتنی دیر پہلے ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہوا تھا۔ بھاری ہو گیا تھا.. مرنے والے کے آخری سانسوں کی' اس کے اعضاء کی گرفت ڈھیلی اور بے جان ہونے پر اس کے اندر جو کچھ تھا' اس کے بے اختیار خارج ہونے پر.. گلے میں بجنے والے آخری گھنگھرو کی صدائیں معلق.. اور بُو ہوتی ہے جو کمرے کی ہر اپر حاوی ہو چکی ہوتی ہے...

اور بُو کے سوا بین ہوتے ہیں..

نہیم سروٹوں' سرکنڈوں' کاہاں' سَر' کوندرے' لائی اور لہنا کے بُوٹوں اور جھاڑیوں

میں سے راستہ بناتا... اور سروٹوں پر اب پچھلے جنم کے سائے جھومر نہ ڈالتے تھے' سویر کی دھند میں گھلی ہلکی روشنی تھی.. ملاحا ہائی نہ بیڑی ٹھیل ساڈھے یار دنجھاں... گنگناتا... آخری ناشتہ... آخری پراٹھے اور غروب کی زردی والے دیسی انڈوں کی زردی کو سنبھالتا اترتا ہے' سروٹوں کے گھنے وجود میں سے نکل کر ریتلے کنارے پر اترتا ہے اور ریت پر اوس کی ٹھنڈک اور جماؤ ہے جس پر پاؤں رکھتا وہ سندھ سائیں کے پانیوں میں ٹھہری کشتی کی جانب چلتا جاتا ہے... اور اپنے گھر واپسی کی مسرت میں دملتا گنگناتا آتا ہے کہ آج پانی کی قید کا آخری دن تھا... آخری ناشتہ تھا..

صاحب' رات کشتی میں ہی رہ گیا تھا..

ان سے جدا ہو کر ادھر آیا تھا اور ادھر ہی رہ گیا تھا..

سویرے' ناشتے کے لیے وہ سروٹوں کے ذخیرے کے درمیان پوشیدہ اس آخری پڑاؤ میں واپس نہیں آیا تھا' جہاں پچھلی شب آگ کی سرخ توانائی کی بھڑکتی' لپکتی اور پھر ٹھنڈی ہوتی زبانوں کے گرد وہ تینوں جھومر ڈالتے تھے.. اسی لیے وہ صاحب کا ناشتہ لے کر ادھر آرہا تھا..

ابھی ہلکی دھند تھی جو پانیوں پر تیرتی تھی..

جیسے تخلیق کے پہلے دن تیرتی تھی.. لیکن ابھی یہ حکم نہیں اترا تھا کہ روشنی ہو جا... صرف طلوع کا مٹیالا سونا تھا' جو سندھ سائیں کی آبی چادر پر بچھا ہوا دکھائی دیتا تھا' جس کے کنارے وہ کشتی فہیم کے آخری ناشتے کی ٹرے کے قریب آتی جاتی تھی' جس کے اندر صاحب ابھی تک سوتا تھا..

کشتی کے تختوں پر جو گل بوٹے نقش تھے' وہ بھی ہلکی دُھند میں دُھندلاتے تھے پر آہستہ آہستہ قربت میں آنے پر دکھائی دیتے جاتے تھے..

فہیم نے چھابے میں دھرے پراٹھے کو اپنی پوروں سے چھوا... ابھی تک گرم تھا' انڈے کی زردی میں بھی ایک نامعلوم سی حدت قائم تھی اور پھر اپنا گنگنانا موقوف کر کے کشتی کے اندر جھانکا...

"ناشتہ کریں گے سائیں.."

سائیں... اپنے سلیپنگ بیگ میں منہ کھولے... بے سُدھ پڑا تھا..

بارہ کہو کے مسمار شدہ کھنڈر میں ملبے تلے دبے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی چلی جاتی تھی..

"خاور... کیا یہ آپ ہیں؟"

سائیں جاگتا نہ تھا... اور فہیم آوازیں دیتا تھا کہ صاحب.. ناشتہ تیار ہے..

صاحب' منہ کھولے اپنے سلیپنگ بیگ میں بے سُدھ سوتا تھا.. اور اس کے چہرے پر ایک مکھی تھی' جو بار بار بیٹھتی تھی... کچھ دیر بیٹھتی تھی.. اور پھر بھنبھنا کر اڑتی اور پھر بیٹھ جاتی تھی..

یہ کسی بھی موت کا... سب سے پہلی یا آخری.. موت کا ماحول تھا یا نہیں... صرف وہ ایک مکھی جانتی تھی جو سائیں کے ادھ کھلے منہ کے ہونٹوں پر... کبھی ماتھے پر اور کبھی بالوں پر بیٹھتی تھی اور پھر بھنبھنا کر اڑ جاتی تھی اور پھر آ بیٹھتی تھی۔

اس نے اسوا پر سوار اونچی ناک والے آریاؤں کی نظروں سے بچ کر ادھر سندھ ساگر کے کناروں پر تین ہزار برس گزار دیے تھے..

اس کا چہرہ مہرہ دراوڑی تھا.. چوڑا جنوروں ایسا جبڑا... بڑے نتھنوں والی پھیلی ہوئی ناک۔ سیاہی میں سلگتی سیاہ لشکیلی آنکھیں اور اٹھی ہوئی لچکدار چھاتیاں جن پر.... اگر وہ سندھ میں ڈبکی لگا کر ابھرتی تھی تو ان پر پانی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے..

وہ اپنا میلا کچیلا جھگا گریبان میں اڑسے اپنے بچے کے منہ میں ایک تنی ہوئی چھاتی دیے اسے دودھ پلا رہی تھی.. اور بار بار اپنے جُتے کو آگے کرتی تھی تاکہ دباؤ سے دودھ بڑھے.. اور بچے کی چپٹی ناک اس کے زور سے مزید چوڑی ہوتی تھی اور اس کا دم گھٹتا تھا.. اور وہ ایسے اطمینان سے اور لاپروائی سے دودھ پلاتی تھی' جیسے کوڑے کے ڈھیر پر دراز ٹانگیں پھیلائے ایک کُتیا اپنے پلّے کے ہونٹوں کو اپنے تھن پر چکتے اور اس کے اندر سے ماں جائی کا رس چوستے ہوئے... نہایت اطمینان اور کسی شرم کے بغیر لیٹی رہتی ہے..

وہ اپنے سیاہ لوتھڑے کو دودھ پلانے میں مگن تھی جب وہ دونوں سندھ ساگر کے کنارے ڈولتی اس کشتی کے قریب آئے' جس میں وہ بار بار آگے ہو کر بچے کے منہ میں دباؤ بڑھاتی تھی..

"سائیں اس کشتی میں اتریں گے.." سرور کے سیاہ ماتھے پر پسینہ دکھائی نہ دیتا تھا۔

دودھ پلاتی سیاہ فام عورت کے سوا ایک سات آٹھ برس کی اُسی کی نسل کی ایک بھورے بدرنگ بالوں والی نہایت غلیظ ننھی سی بچی تھی' جو کشتی کے فرش پر رکھے مٹی کے چولہے پر چڑھی ہنڈیا میں بے دلی سے ڈوئی ہلاتی تھی... سرور نے جب یہ کہا کہ سائیں اس

کشتی میں اتریں گے تو اس نے ان بدیشیوں پر اپنی جنوروں ایسی کالی بھور آنکھیں پل بھر کے لیے اٹھا کر مرکوز کیں اور پھر ان کی موجودگی سے غافل ہو کر ڈوئی چلانے لگی۔

یہ کشتی... ایک کٹیا تھی..

پانیوں کے جنگل میں ایک بسیرا تھا.. اس کے اندر تام چینی کے پچکے ہوئے دھوئیں کی سیاہی میں پوچے ہوئے برتن تھے.. میلے کچیلے بستر' گھی کے خالی ٹین' کچھ اُپلے اور ایک کونے میں ڈھیر ایک جال تھا.. اور عورت کے کچے دودھ کی مہک تھی..

"سرور..." عباس برمانی نے دھیمے غصے میں اس کا نام لیا.. وہ دھیمے مزاج کا دھیمی بات کرنے والا شخص تھا اور اپنی آواز کو بلند کرنے پر قادر نہ تھا..

سرور اس سائیں کے دھیمے پن سے آشنا تھا اس لیے فوراً چوکنا ہو گیا..

"ابھی خالی ہو جاتی ہے سائیں... اوئے پکھیے.." اس نے دودھ پلاتی عورت کو ایک للکارا مارا...

عورت نے اس للکار کا کوئی اثر نہ لیا.. آنکھ اٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ کون ہے... صرف اپنا میلا کچیلا جھگا جو گریبان میں اڑسا ہوا تھا' نیچے کر لیا تاکہ اس کی چھاتی اور اس پر بیتابی سے منہ مارتا بچہ زیادہ دکھائی نہ دے' اسے ان غیروں کی نظر نہ لگے.. یہ اونچی ناک والے جدھر دیکھتے تھے... ہڑپہ یا موہنجو کو جدھر دیکھتے تھے اسے کھنڈر کر دیتے تھے.. ان کی نظر بد سے اگر وہ آج تک بچتی آئی تھی تو آج بھی بچ جائے..

"یہ تو ابھی خالی کھڑی ہو جاتی ہے سائیں.." سرور اس عورت کی بے اعتنائی سے بہت واقف تھا اور شرمندگی کا پسینہ اگرچہ اس کے ماتھے پر دھوپ کی حدت سے جل کر پھوٹتا جاتا تھا' لیکن دکھائی نہ دیتا تھا..

غازی گھاٹ کے ناقص اور دراڑوں سے بھرے ڈولتے پل کے نیچے... سندھ ساگر کے بائیں کنارے پر مہانوں کی تین کشتیاں.. تین کٹیائیں.. تین بسیرے.. ہولے ہولے ڈولتے تھے اور ان کے قریب ریت پر کڑی دھوپ میں سرکنڈوں کے چند چھپر تھے' جن کے سائے میں سرور اور پکھی کی نسل کے مہانے... بوڑھے' بچے اور عورتیں... کانبھاں کی شاخوں سے ٹوکرے بنتے تھے اور لائی کی لکڑی سے پنکھیوں کی ڈنڈیاں تراشتے تھے اور پسینے میں نہاتے تھے اور ان کے سیاہ بدنوں پر جو دھاریں بہتی تھیں' وہ نظر نہ آتی تھیں اور فوراً

خشک ہو جاتی تھیں۔

اُن سب نے.. جو چھپّروں کے سائے میں سر جھکائے بیٹھے تھے اُن دونوں کی آمد میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی.. ایک بار توجہ کی کہ غازی گھاٹ پل سے اُتر کر کون آیا ہے اور پھر سر جھکا کر سندھ ساگر کے بیلوں میں سدا سے اگنے والے سرکنڈوں... لائی اور کاہباں کے سرکنڈوں سے.. تب سے اگنے والے جب اونچی ناک والوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا.. ان سے ٹوکرے باندھنے اور پنکھیوں کی ڈنڈیاں بنانے اور تراشنے میں محو ہو گئے..

اگرچہ ابھی سردرتیں رخصت نہ ہوئی تھیں لیکن دوپہر کی شدت پانیوں کی نزدیکی کے باوجود کم نہ ہوتی تھی... بلکہ پانی دھوپ کو دوچند کر کے چہروں کو چندھیاتے تھے..

ادھر نیچے سندھ ساگر کی قربت میں مہانوں کی کشتیاں.. تین کشتیاں ڈولتی تھیں..

برمانی سامان کو ترتیب دینے کے لیے اوپر بند پر جا چکا تھا۔

اور اوپر... غازی گھاٹ کے مخدوش پل کے داخلے پر... ملتان سے مظفر گڑھ کے راستے پر.. مسافر بسوں' ویگنوں' ٹریکٹر ٹرالیوں اور پرائیویٹ کاروں کی ایک لمبی... بے چین اکتائی ہوئی ایک کسمساتی ہوئی قطار تھی' جو مخالف سمت سے آنے والی ٹریفک کے خاتمے کی منتظر تھی.. بار بار انجن سٹارٹ ہوتے تھے اور پھر لاچارگی سے بند ہو جاتے تھے... اور ہارن بے وجہ اور مسلسل بجتے چلے جاتے تھے.. دوسری جانب سے آنے والی ٹریفک کا بہاؤ کم ہی نہ ہوتا تھا.. وہ آخری ویگن یا ٹریکٹر ٹرالی آتی ہی نہ تھی' جس کے بعد وہ اپنی سواری کو حرکت میں لا کر پل پر ڈال سکتے تھے۔

پُل کی تعمیر کو اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن وہ اب دو طرفہ ٹریفک کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں تھا..

گنڈیریاں بیچنے والے.. مقامی کھویا اور نمکین والیں فروخت کرنے والے بچے اس رکے ہوئے ٹریفک کے اژدہام میں سے اپنی روزی کشید کرتے تھے..

اوپر... شور و غل کی یہی کیفیت مسلسل تھی..

اور اِدھر نیچے...

پُل کے آہنی ڈولتے ہوئے وجود کے عین نیچے.. مہانوں کی یہ چھپّر بستی

تھی.. سندھ ساگر کے کنارے.. ان کے گھر.. ان کی تین کشتیاں تھیں.. ہزاروں برس پیشتر جانے وہ کس سرسوتی کے کناروں پر آباد تھے جس کے سوکھنے پر... وہ ادھر آ نکلے تھے.. اونچی ناک والوں کی نظر بد سے بچ کر.. اور زمین کو تیاگ کر پانی کو گھر بنالیا تھا..

اور ان ڈولتی کشتیوں میں سے ایک ایسی تھی جس کے اندر... اپنا جھگا نیچے کیے اپنے بچے کو چھپائے دودھ پلاتی ایک عورت تھی' ایک ہانڈی میں بے دلی سے ڈوئی چلاتی بچی تھی اور ان دونوں کو اب صرف اس کے لیے.. ایک اونچی ناک والے کے لیے... اس گھر سے بے گھر ہونا تھا.. صرف اس کے دھن کے لیے.. اپنا بوریا بستر سمیٹنا تھا.. چولہا بجھانا تھا. پکے ہوئے تام چینی اور سلور کے دھواں لگے برتن اٹھانے تھے.. اور اُسے چھاتیوں میں سے بہتے کچے دودھ کی مہک سے خالی کر دینا تھا.. صرف دھن کی خاطر... کنارے کے کسی چھپر میں جا رہنا تھا اور تب تک رہنا تھا جب تک یہ غیر لوگ کشتی میں گھوم پھر کے پرندے مار کر واپس نہیں آجاتے.. سندھ ساگر میں کیا تھا جو یہ لوگ اپنے شہر چھوڑ کر ادھر آجاتے تھے.. ہمیشہ کلیجہ دھڑکتا تھا کہ یہ کشتی لے کر جائیں گے اور پھر کبھی نہیں لوٹیں گے.. زور زبردستی سے اس پر اپنا حق جتائیں گے.. اس میں آباد ہو جائیں گے.. اونچی ناک والوں کو دیکھ کر اسی لیے ہمیشہ کلیجہ دھڑکتا تھا.

بہت بعد میں.. جب وہ اس کشتی میں کئی روز پانیوں پر سفر کر چکا تھا.. آج کی اس عورت کی دودھ پلاتی اٹھی ہوئی چھاتیوں کو بھول چکا تھا.. اس گدلے پانیوں ایسے بالوں والی بچی کے آگے چولہے پر دھری ہانڈی اور اس میں چلتی ہوئی ڈوئی کو یکسر فراموش کر چکا تھا.. اور اس کشتی کے سوا اپنے وہ سب گھر' جن میں اس نے زندگی بتائی تھی' وہ فلیٹ وہ کمرے وہ سب چھتیں اس کی یاد سے محو ہو چکی تھیں جن میں اس نے یہ ساٹھ برس بسر کیے تھے۔ ان گھروں اور کمروں میں اس کی ماں تھی اسے گرائپ واٹر پلاتی ہوئی... شانے سے لگا کے اس کی ننھی سی پیٹھ تھپکتی ہوئی تاکہ وہ دودھ ہضم کر کے ڈکار لے.. بہن بھائی تھے.. اور آوارہ گرد باپ تھا جو یکدم کسی بھی صبح اپنے بستر پر نہ ہوتا' کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر غائب ہو جاتا.. مہینوں اس کی خبر نہ ملتی.. ایک بار وہ پورے تین برس تک لاپتہ رہا.. واپس وہ بہر حال آجاتا اور جب واپس آتا تو اس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہوتی' لاغر اور لاچار ہوتا' عجیب لباسوں میں ہوتا اور کبھی نہ بتاتا کہ وہ کہاں تھا' کدھر تھا اور کیوں تھا.. بس کسی ایک شام وہ

دروازے پر دستک دیتا... بچوں کو ایک نظر دیکھتا' جو اس کی غیر موجودگی میں بڑے ہو چکے ہوتے اور پھر ماں سے کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں جا کر سو جاتا.. دو تین روز بعد کسی صبح بیدار ہو کر کمرے سے باہر آتا اور صرف یہ کہتا "آج ناشتے کے لیے کیا ہے؟" اور پھر ویسا ہی گھریلو اور پُر شفقت ہو جاتا جیسا کہ وہ گم ہونے سے پیشتر ہوا کرتا تھا... ماں بڑے اہتمام سے اس کی غیر موجودگی کے دنوں میں اس کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرتی اور بستر کی چادر تبدیل کر دیتی... اور ان کمروں اور چار دیواریوں میں کچھ محبتیں تھیں' بہت ساری اذیتیں تھی' شرمندگی تھی.. اس کی بیوی تھی.. اور اولاد تھی.. لیکن وہ ان سب کو پانیوں کے طویل سفر کے دوران بھول چکا تھا اور اس کے لیے گھر صرف ایک کشتی تھی جس میں ابھی ایک دودھ پلاتی عورت اور ہانڈی میں ڈوئی چلاتی بچی تھی..

جب وہ سدا سے اس کشتی میں تھا.. ہمیش سے پانیوں پر بسیرا کرتا تھا.. سب کچھ بھول چکا تھا سوائے اپنے ساٹھ برسوں کے تب ایک روز اس نے دیکھا کہ سرور اگرچہ اس کشتی کو اپنے اسباب اور بوریا بستر سے خالی کر چکا تھا لیکن ایک زنگ آلود کیل سے ٹنگا نیلے پلاسٹک میں جڑا ایک آئینہ رہ گیا تھا.. اس کے ساتھ شاپر بیگ کی ایک پوٹلی بھی رہ گئی تھی جس میں تبت سنو کی ایک تقریباً خالی شیشی' ایک شکستہ دندانوں والی کنگھی اور نیلے رنگ کی ہی ایک سستی لپ سٹک کا ٹکڑا رہ گیا تھا.. یہ جانے کس کا سامان آرائش تھا.. پکھی کا نہیں کہ وہ ان کے ہمراہ سفر کرتی تھی.. شاید یہ ڈوئی چلاتی بچی کی سب سے قیمتی متاع تھی.. کیل سے ٹنگے اس بجھے ہوئے آئینے نے اسے سحر سے بھرے بہت سے آبی منظر دکھائے... وہیں کشتی کے فرش پر لیٹے ہوئے' اسے دریا تو نظر نہ آتا لیکن سرور کے میلے گدّوں پر لیٹے ہوئے جب اس کی نظر اس آئینے پر جا ٹھہرتی تو ایک خاص زاویے سے اس میں سندھ ساگر کا ایک حصہ بہتا ہوا دکھائی دینے لگتا.. جیسے ایک پوسٹ کارڈ کے سائز کی ٹیلی ویژن سکرین پر کوئی دریائی منظر چل رہا ہو... لیکن یہ بہت دن بعد کی بات تھی.. اور ابھی سرور نے پھر ان کو تسلی دی تھی کہ کشتی ابھی خالی ہوئی کھڑی ہے سائیں اور "اوئے پکھیئے.." ذرا غصے میں آ کر کہا تھا.. عورت نے ناگواری سے بچے کا دودھ چھڑایا' جھگا درست کیا لیکن اٹھی نہیں وہیں گوٹھ مارے بیٹھی رہی...

سرور نے ایک بار پھر سے پکھی کو جھڑکا اور پھر ان سے اجازت لے کر نیل کے

پہلو میں پتھروں کے اونچے بند پر ڈھیر اس کا سامان نیچے لانے کے لیے آہستہ آہستہ بند پر چڑھنے لگا۔

سرور گیا تو کشتی میں گوٹھ مارے بیٹھی عورت جواب بچے کے پیٹ پر تھپکیاں دے رہی تھی' ڈوئی چلاتی بچی... اور چھپروں تلے پنکھیوں کی ڈنڈیاں تراشتے اور ٹوکرے بناتے بوڑھے بچے اور عورتیں اسے سیاہ آنکھوں کے جال میں جکڑنے لگے۔ اپنا کام کاج چھوڑ کر صرف اسے دیکھنے لگے' جیسے وہ صرف سرور کی موجودگی سے اچکچا رہے تھے اور اب ایک غیر وجود کی دخل اندازی کو ناپسندیدگی سے گھورتے تھے..

دوپہر بہت کڑی اور تیز تھی..

اور سندھ ساگر کے ریتلے کنارے پر وہ مزید کڑی اور تیز ہوتی تھی۔

حلق سوکھتا تھا۔

اس نے ماتھے پر سیلوٹ کے انداز میں ہتھیلی رکھی تو اس کے سائے میں آکر آنکھوں کو تیز دھوپ سے سکون ملا اور وہ اوپر دیکھنے لگا جدھر سرور گیا تھا۔ وہ بند کے اوپر پہنچ کر جانے کیا کر رہا تھا' سامان باندھ رہا تھا نیچے لانے کے لیے یا دم لینے کی خاطر کیکروں کے سائے تلے سستا رہا تھا.. یہاں سے کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا..

وہ اب بھی اس سفر کو ترک کر سکتا تھا.. اس کا جواز کچھ بھی نہ تھا... عمر اور محبت سے فرار ہونا تو کوئی جواز نہیں۔

یہ سفر اب بھی منسوخ کیا جا سکتا تھا..

اوپر بند پر پہنچ کر وہ برمانی کو کہہ سکتا تھا کہ ڈاکٹر.... نہیں!

لیکن یہ روانگی سفر کا پہلا خوف پہلا وسوسہ تھا جسے اس نے دبا دیا.. اب تو کنڈی پانی میں ڈال دی گئی تھی بھلے اس کے ساتھ کوئی مچھلی لگے نہ لگے.. اب اسے ترک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سندھ ساگر کے پانی بہت معمولی اور گدلے.. ان میں کوئی خاصیت نہ تھی.. دور تک بہتے جاتے تھے.. یہی پانی وادیٔ چپلو کے راستے میں اتر کر دریائے شیوک میں مدغم ہوتے تھے.. اگرچہ اس مقام پر شیوک کا وجود اس سے کہیں بڑا اور چوڑے پاٹ کا تھا لیکن ان دونوں کے ملاپ کے بعد... شاید اس میں نصیب کا عمل دخل تھا کہ اسے شیوک کی بجائے سندھ کا

نام ملا... گول کے قصبے سے گزر کر وہ سکردو کی عظیم وسعت میں پھیلاؤ کا ایک ایسا منظر تخلیق کرتا تھا جو دیکھنے والوں کو حیران کرتا تھا... وادیٔ شگر سے آنے والے شاہ گوری کی برفوں والے دریا بر الدو کے پانی بھی اب اس میں شریک تھے.. سکردو سے آگے وہ تنگ درّوں اور اونچی چٹانوں میں گھر کر چنگھاڑتا اور وحشی ہوتا تھا.. اپنے وجود میں گرنے والی چٹانوں کو لمحوں میں پیس کر ریت بنا دیتا تھا.. بشام میں اس کی سلیٹی چادر کروٹیں بدلتی تھی.. اس کی پھنکار مدھم پڑتی جاتی تھی کہ اب روانی کے دن قریب آتے تھے... پہاڑوں کے شکنجے سے نکل کر اب بہاؤ میدانوں کی جانب تھا لیکن ایک فرق کے ساتھ... وہاں یہ صرف ایک دریا تھا اور یہاں غازی گھاٹ کے پل کے نیچے وہ ایک تہذیب تھا.. وہاں اس کے کناروں پر جو لوگ رہتے تھے' تو اس کے پانیوں سے کہیں بلند اپنے کوہستانی گھروں میں رہتے تھے.. اس سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتے تھے.. ان کا آپس میں کوئی میل نہ تھا.. وہ کہیں نیچے تھا اور وہ کہیں بہت اوپر... لیکن یہاں وہ دونوں ایک دوسرے میں رہتے تھے.. یہاں وہ اس کے پانیوں میں رہتے تھے اور ان میں بسیرا کرتے تھے.. یہ رزق تھا' جواز تھا اور وجود تھا.. یہاں پہنچ کر سندھ معتبر ہو گیا تھا..

اس نے آنکھوں کے آگے ہتھیلی کے چھجّے کو ذرا اوپر کیا اور بند کے پتھروں کی جانب وہاں دیکھا جہاں سرور شائد کیکروں کے سائے میں سو رہا تھا اور برمانی سامان کو ترتیب دے رہا تھا..

گردن گھما کر اس نے اُدھر دیکھا جدھر "انڈس کوئین" تھی..

اس کشتی' بستی اور تیز دھوپ میں تقریباً سلگتے سکوت میں آئے سرکنڈوں کے چھپروں سے پرے... سندھ کے ریتلے کنارے سے پرے' جہاں سے ہریاول اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا وہاں.. ان کھیتوں میں "انڈس کوئین" تھی..

ابھی جب وہ ایک کھڑکھڑاتی اپنے اور مسافروں کے انجر پنجر جھنجھوڑتی ٹویوٹا ہائی لیکس میں اس آبی سفر کے سامان لادے برمانی کے ہمراہ چوٹی زیریں سے آغاز کر کے اوپر غازی گھاٹ کے پل پر اترا تھا' اپنے آپ کو مسافت کے جھولنے سے جھٹک کر قائم کیا تھا اور چہرے پر سے گرد پونچھی تھی تو پل پر سے اس نے نیچے کشتی بستی اور چھپروں اور مہانوں کے ننگ دھڑنگ سیاہ بچوں کو اس نے بعد میں دیکھا تھا.. اس کی نگاہ سیدھی "انڈس کوئین" پر جا ٹھہری

تھی.. اس نے خیال کیا کہ ادھر سائیں انڈس کی کوئی شاخ نکلتی ہے... بہاؤ سے جدا ہو کر الگ ہوتی ہے جس میں یہ پرانی وضع کا سٹیم شپ مسافروں کی آمد کا منتظر لنگر انداز ہے اور عین ممکن ہے کہ جتنی دیر میں وہ ٹویوٹا سے سامان اتروا کر پُل سے نیچے اترے وہ اپنا بھونپو بجا کر دھواں چھوڑتی سندھ میں داخل ہو کر رواں ہو جائے.. وہ دریائے مسس پی میں چلنے والے کسی قدیم سٹیم شپ کی کوئی عزیزہ تھی جو بھٹکتی ہوئی ادھر آنکلی تھی.. اپنے کسی مارک ٹوین کے ساتھ.. سونے کی تلاش میں سرگرداں ایک کاؤبوائے' غلاموں کے کسی سوداگر اور دربدر ہونے والے ایک ٹریپ ایک آوارہ گرد کے ساتھ...

لیکن وہ... دریائے مسس پی میں چلنے والے بھونپو بجاتے' سفید دھواں چھوڑتے کسی سٹیم شپ کی عزیزہ نہ تھی..

اور انڈس کی کسی ذیلی شاخ میں لنگر انداز نہ تھی۔

وہ خشکی پر ویران پڑی تھی... اس کے پانیوں کے سفر کے دن پورے ہو چکے تھے..

زنگ آلود شکستگی سے دوچار ڈھانچہ سندھ کے پانیوں سے دور ہرے بھرے کھیتوں میں جلاوطن تھا.. اس کا وسیع اور بھاری وجود موسموں اور مدتوں سے اپنا توازن ڈانواں ڈول کر چکا تھا اور وہ سندھ کی جانب ہلکے جھکاؤ میں تھی جیسے ان کی آرزو میں ایسی ہو گئی ہو.. اور یہی جھکاؤ اس کے بے جان ہونے کی دلیل تھا۔

وہ تنہا کھڑی تھی.. سندھ کے پانیوں پر حکمرانی کرنے والی اجڑ چکی ملکہ...

جیسے ایک سفید وہیل سمندر کے زور آور پانیوں کے ریلے میں بے اختیار بہتی ہوئی کنارے سے دور ریت پر رہ جاتی ہے اور پانی سمٹتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں' اسے تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ تڑپتی ہے.. گھسٹتی ہے.. گلپھڑے پھلا پھلا کر دم پٹختے ہوئے سعی کرتی ہے کہ اپنے پانیوں میں واپس چلی جائے.. اور بالآخر بے جان ہو جاتی ہے۔

"انڈس کوئین" بھی جانے کن زمانوں میں اپنے پانیوں سے بچھڑی تھی اور اب مدت سے بے جان پڑی تھی.. ایک ڈھانچہ ہو چکی تھی.. اب اگر وہ پانی کسی طور اس تک پہنچ بھی جائیں' اس کے آہنی وجود کو بھگو بھی دیں تب بھی اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ ان پر تیرتی ہوئی سندھ کے بہاؤ میں جا شامل ہو.. وہ ہمیشہ کے لیے کھنڈر ہو چکی تھی..

اس دراوڑ مہاندرے کی عورت پکھتی سے.. بچی کی ہانڈی میں مسلسل چلتی ڈوئی سے..اور چھپروں تلے گھومتی مرغیوں اور ٹوکرے باندھتے ڈنڈیاں تراشتے لوگوں سے..وہ شرمندگی کی نظریں بچائے.. کہ ان سب کے چہروں پر اس کے لیے ناپسندیدگی کے سوا کچھ نہ تھا..وہ ان سے پرے ہوا..اور وہ یہاں بے مقصد گھڑا کرتا بھی کیا..اس نے ان سے منہ موڑا اور چلنے لگا..ریت جو بہت ٹوستی گرم تھی اس میں سے پاؤں مشکل سے کھینچتا...پسینہ پونچھتا اس مردہ وہیل کی جانب چلنے لگا...سرور ابھی تک اوپر تھا' سامان باندھتا یا سوتا تھا..وہ اس ڈھانچے کو ایک نظر دیکھنے کے لیے گرم ریت پر چلنے لگا..اس کے قریب ہوتا گیا..اور قریب ہوا تو وہ زنگ آلود ہواؤں اور موسموں کا کھایا ہوا وجود جو دور سے ایک معمولی دو خانی جہاز لگتا تھا کھیتوں میں پھنسا ہوا تو وہ ایک ٹائی ٹینک کا مجسم اختیار کرتا گیا...پانی کی گہرائی میں ڈوبنے کی بجائے خشکی پر غرق شدہ..کھنڈر ہوتا..کھیتوں کے بیچ وہ ایک آہنی کرسمس کیک کی طرح پڑا تھا..جس کی چادر پگھلی ہوئی تھی اور سفید پینٹ کی پپڑیاں اتر رہی تھیں..

اس کے دامن میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھنے سے اس کے وجود کا بے پناہ انبار گرتا ہوا محسوس ہوتا تھا..ترچھا ہو کر جھکا ہوا جیسے برسوں کی تپسیا کے بعد ایک نیم جان جوگی پہلو بدلتا ہے تو توازن قائم نہیں رکھتا ضعف سے ایک جانب جھک جاتا ہے۔

ایک آہنی اور سالخوردہ زینہ اوپر عرشے کے ساتھ جڑا ہوا تھا..

زینے کا سہارا لرزش میں تھا' راڈ جسے تھامتا وہ اوپر جاتا تھا دھوپ کی حدت جذب کیے اس کی مٹھی میں چھالے ڈالتا تھا..وہ آہستہ آہستہ بلند ہو کر عرشے پر آگیا...

جیسے میکسیکو کے قدیم ازٹکا اہرام میں کوئی ماہر آثار قدیمہ کھوج لگاتا پہلی بار داخل ہو..باہر رہ گئے استوائی جنگلوں کے بعد پہلا سانس اس ہوا میں لے جو ہزاروں برسوں سے ٹھہری ہوئی ہو..اور اس میں تادم ہنوز ان تمام لوگوں کے سانس ابھی تک موجود اور محفوظ ہوں..پجاریوں اور غلاموں کے سانس جو یہاں اپنے سونے کے دیوتاؤں کے سامنے جھک کر اس زیرزمین تاریک دنیا سے رخصت ہو گئے ہوں..وہاں ظروف ہوں سونے کے اور نقاب ہوں بادشاہوں اور ملکاؤں کے..جو اندھیرے میں بھی لو دیتے ہوں..تو وہ شخص جھجک جاتا ہے..کہ میں مخل ہوا ہوں' مجھے ہزاروں برس کا یہ سکوت نہیں توڑنا چاہئے تھا...

خادر نے بھی یہی محسوس کیا..اسے مخل نہیں ہونا چاہئے تھا۔

کیونکہ "انڈس کوئین" کے ڈھانچے کے اندر ان تمام مسافروں کے سانس اور وجود موجود تھے جنہوں نے کبھی اس کے عرشے پر قدم رکھا.. اس میں سفر کیا.. کوٹ مٹھن تک... پولیٹیکل ایجنٹ.. برٹش راج کے وفادار فیوڈل.. اس کے رکھوالے مقامی سپاہی اور انگریز افسر... یسوع کی روشنی سے نیٹوز کے غیر تہذیب یافتہ مہاندروں کو چندھیانے والے مشنری... سیاہ فام نرز.. جو بھیل دراوڑوں کی بستیوں سے نکل کر یسوع کی دولہنیں بن گئی تھیں اور معتبر ہو گئی تھیں.. انہوں نے اپنے آپ کو برتر سمجھنے والے ہزاروں برسوں سے دھتکارنے والے ہندوؤں' مسلمانوں اور سکھوں سے بدلہ لیا تھا اور راج کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے ان سے بلند ہو گئی تھیں.. اور طالع آزما آوارہ گرد یورپی جن کے سفر نامے فوجی مہمات کے دوران راج کے لیے بے حد مفید ثابت ہوتے تھے.. یہ سب غیر مرئی طور پر یہیں انڈس کوئین کے ڈھانچے میں موجود تھے اور سانس لیتے تھے۔

کچھ کے سانسوں میں برانڈی اور سکاچ مہکتی تھی۔

عرشے کے دھول آلود اور دیمک کے چاٹے ہوئے چوبی تختے جابجا اکھڑے ہوئے تھے اور ان پر پاؤں دھرتے خیال کرنا پڑتا تھا.. البتہ لوہے کے بھاری زنگ کھائے ہوئے لنگرا بھی جوں کے توں تھے اور عرشہ انہیں ابھی تک سہار رہا تھا..

عرشے کے بعد ایک راہداری آتی تھی' جس کے بائیں ہاتھ پر جھکی ہوئی کہیں کہیں سے شکستہ وہ ریلنگ تھی' جسے تھام کر سندھ میں ڈبکیاں لگاتی اندھی ڈولفن کو گئے وقتوں کے مسافر دیکھتے تھے اور اس کی نابینائی کو سمجھ نہ پاتے تھے.. اور بائیں جانب ونیشن بلائنڈز کی ایک عمودی قطار کے پیچھے انڈس کوئین کے مختصر دی آئی پی لاؤنج کے آثار دکھائی دیتے تھے.. ٹوٹا ہوا دروازہ مقفل تھا.. خاور نے انگلی سے ایک بلائنڈ کے لچکیلے پلاسٹک کو بائیں طرف کیا اور اپنی ناک قریب لا کر اندر جھانکا.. دھول اندر کی ہر شے کو کاٹھ کباڑ کو بے رنگ کرتی آرام کرتی تھی.. وکٹورین صوفوں کے ڈھانچے گرد میں اٹے چپ میں تھے۔ پوشش کے دامن میں دھجیوں کے سوا کچھ باقی نہ تھا اور ان میں سے زنگ خوردہ سپرنگ آہنی سکتے میں آئے ہوئے مرغولوں کی طرح ڈھانچے میں سے اٹھتے تھے.. ایک سپرنگ پر چیتھڑ کی ایک دھجی اٹکی ہوئی تھی جو شاید کسی میم صاحب کے فراک کی تھی جس نے آخری بار اس پر بیٹھنے کی کوشش کی اور سپرنگ کی چبھن سے فوراً ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی.. فرش پر بوسیدگی اور بدرنگی

میں ڈوبا ہوا ایک قالین تھا جو صوفوں کے ڈھانچوں کے آگے جہاں پاؤں آرام کیا کرتے تھے بالکل گنجا ہو چکا تھا۔ ایک سائیڈ ٹیبل پر ایک گلاس کی کرچیاں اور ایک ایش ٹرے تھی جس میں راکھ اور گرد محفوظ ہو رہی تھی..

اس نے انگلی پیچھے کی تو وینشن بلائنڈ اپنی جگہ پر آگیا اور لاؤنج کی بے پردگی ختم ہو گئی۔

صاحب لوگوں کے اس مختصر لاؤنج کے برابر میں عرشے میں سے ایک زینہ اترتا تھا جو شاید کیپٹن کے کمرے اور انجن روم تک جاتا تھا.. نیچے جانا دشوار اور خطرناک تھا.. کیونکہ زینے کے تختے اکھڑے ہوئے تھے اور وہ ایک گنجی ہوتی کنگھی کی طرح اٹکا ہوا تھا.. دو چار دندانے باقی تھے جو یقیناً اس کا بوجھ نہیں سہار سکتے تھے.. اس میں اترا تو نہیں البتہ ریلنگ تھام کر جھانکا ضرور جا سکتا تھا... یہ ایک فراموش شدہ خشک کنواں سا تھا جس کی تہہ میں بکھرے کاٹھ کباڑ کی دھول میں سے ایک پچکی ہوئی ایک ایسے غبارے کی طرح جس میں سے ہوا ایک عرصے سے خارج ہو چکی ہو ایک لائف جیکٹ دکھائی دیتی تھی ایک مردہ مچھلی کی طرح جس کے گلپھڑے سوکھ چکے ہوں.. البتہ اس کی پچکی ہوئی مردہ گولائی پر "QUEEN...." کے حرف اگرچہ پھیکے پڑ چکے تھے لیکن پڑھے جا سکتے تھے.. ان سے پیشتر جو "INDUS" تھا اسے دھول اور زمانہ چاٹ چکا تھا..

کنویں میں ایک لیمپ شیڈ اوندھا پڑا تھا.. زمانے اور وقت نے اسے بھی ناک آؤٹ کر دیا تھا..

راہداری سے آگے جہاں عرشہ پھیل کر انڈس کوئین کے پچھلے حصے میں اس ریلنگ تک جاتا تھا جسے تھام کر کھڑے ہونے والے مسافر پیچھے رہ جانے والے انڈس کے کھولتے پانیوں کو دیکھتے تھے اس آبی ہلچل کا نظارہ کرتے تھے جو ان کی نظروں کے سامنے بہاؤ کا ایک حصہ بن کر پھر سے پر سکون ہوتی جاتی تھی وہاں ایک کونے میں عرشے میں گڑا ایک سفید کموڈ تھا.. ایک اجڑی ہوئی لیٹرین کی برہنگی عیاں ہو رہی تھی۔ اس کموڈ کے گرد جو چوبی دیواریں وال پیپر سے ڈھکی ہوئی ان لوگوں کو پوشیدہ کرتی تھیں جو اس پر بیٹھتے تھے مسمار ہو چکی تھیں اور ان کا کوئی نشان باقی نہ تھا..

صرف ایک سفید کموڈ تھا عرشے کے چوبی فرش میں ندامت کی کیلوں سے گڑا

ہوا.. ہزاروں بار فلش ہونے کے باوجود کموڈ کے اندر "شینکس۔ لیڈز" کے الفاظ ابھی تک واضح تھے۔

صرف ایک کموڈ... عرشے پر رکھا نہایت عجیب اور بے موقع لگ رہا تھا..

اگر "انڈس کوئین" میں ابھی تک وہ سب تھے جنہوں نے کبھی بھی اس کے عرشے پر قدم رکھا تو ان میں وہ گورے بھی موجود تھے جو بیئر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس کموڈ پر جھومتے تھے..

ایک وکٹورین اخلاقیات کی وہ میم صاحب بھی تھیں جو یہ سمجھتی تھیں کہ لیٹرین کی دیواریں انہیں عرشے پر ٹہلنے والے ایک اجنبی سے چھپاتی ہیں اور وہ بے دھڑک اپنا فراک اٹھا کر... انڈور ریئر سے سٹاکنگ کے کلپ کھول کر یہ پروانہ کرتے ہوئے کہ ان کی "سلپ" دکھائی دیتی ہے.. بے دھڑک اس پر بیٹھتی تھیں..

اس کموڈ نے راج کے وہ حصے دیکھے تھے جو دیکھنے والے نہیں ہوتے..

ایک ماڈرن سٹل لائف پینٹنگ کی طرح سفید کموڈ ایک ویرانے میں تنہا تھا..

"انڈس کوئین"... کے اگلے حصے میں لاؤنج اور انجن روم میں اترتی سیڑھیوں کے ساتھ اس سٹیم شپ کو سندھ ساگر میں چلانے اور سمت درست رکھنے والا لوہے کا وہ گرانڈیل وہیل تھا ہوا تھا جس پر کپتان کی گرفت اسے ریتلے ٹاپوؤں پر چڑھ جانے اور پایاب پانیوں میں اٹک جانے سے بچاتی تھی.. یہ ابھی تک مضبوط اور توانا تھا لوہے کی سختی اور دوام قائم رکھے ہوئے.. اس پر موسموں اور گرد کے جھکڑوں اور نمی کا کوئی اثر نہ ہوا تھا زنگ کی ہلکی تہہ کے سوا.. "ہیملٹن ونڈسر۔ بلڈنگ پائینئر۔ لیورپول 1868" کی عبارت لوہے میں کندہ تھی۔ راج کا لوہا زنگ زدہ ہونے کے باوجود ابھی تک قائم اور مضبوط تھا۔

"انڈس کوئین"

"شینکس.. لیڈز"

".... کوئین"

اور "ہیملٹن ونڈسر۔ بلڈنگ پائینئر.."۔ اس کھنڈر ڈھانچے کی چار عبارتیں.. اس کے ماضی کے نامکمل نشان..

گرانڈیل وہیل تلے عرشے پر گنے کے پھوک کی ڈھیریاں سوکھتی تھیں..

"انڈس کوئین" اس سے بڑھ کر بے توقیر کیا ہو سکتی تھی کہ اسے راستے پر ڈالنے والے اس آہنی وہیل کو اب ایک بیلنے کے طور پر گنے کا رس نکالنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا.. شاید یہی کشتیوں والے مہانے یا اوپر سے آئے ہوئے منچلے راتوں کو ادھر آتے تھے.

یکدم "انڈس کوئین" کا ڈھانچہ سکوت سے یوں لگا کہ حرکت میں آنے کو ہے.. اس کے قدموں تلے عرشے میں لرزش سی محسوس ہوئی۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے ریلنگ کو تھام لیا.. اور پھر فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ ایسا ہو نہیں سکتا.. دھوپ کا اثر تھا شاید..

ریلنگ سے پرے ریتلے علاقے کے آخر پر سندھ کے پانیوں میں ڈولتی کشتی کے قریب سرور اس کا سامان بند سے اتار کر لے آیا تھا اور اب آنکھوں پر ہاتھ رکھے اسی کی جانب "انڈس کوئین" کے ڈھانچے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا لیکن الجھن میں تھا کہ صاحب ادھر گیا ہے یا کسی اور جانب چلا گیا ہے.. پکھی اپنے گھر کو خالی کر رہی تھی اور بھورے بالوں والی بچی اپنی ہانڈی کے کناروں پر ایک چیتھڑا لپیٹے اسے اٹھائے ہوئے کشتی سے باہر آنے کو تھی.

چھپروں تلے مہانے ڈنڈیاں تراشتے تھے' ٹوکروں پر جھکے تھے اور ان کے سیاہ جثے ریت سے الگ نظر آتے تھے.

ایسے لوگوں کو اس نے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا...

وہ پانی کے باسی تھے اور وہ زمین سے آیا تھا..

سندھ ساگر کے کنارے یہ پانیوں کا لونگ تھے.. پانی کے پروردہ... آبی جنور... آسٹریلوی ابورجنیز ایسے بھورے گدلے بالوں اور ننھی پستہ قد جثوں والے کیڑے مکوڑے جو سندھ کی اُس پہلی بوند کے ساتھ جو جھیل مانسرور میں سے ٹپکی تھی.. اس پہلی بوند کے یہاں تک پہنچنے کے لمحے میں ہی کسی انسانی بوند کے کسی کوکھ میں ٹھہرنے سے وجود میں آئے تھے اور ان کی کشتیوں اور چھپروں سے پرے کھیتوں میں خشکی پر لاچار پڑی یہ انڈس کوئین تھی جو.. وقت کا ایک لمحہ تھی.. راج کی ایک لہر تھی جو آئی اور گزر گئی.. وہ تب بھی انہی کشتیوں اور چھپروں کے باسی تھے' انہوں نے اس لہر کو ذرا جھک کر گزر جانے دیا.. اور اب وقت کا ایک اور لمحہ تھا..

اور میں اس لمحہ' موجود کا پروردہ تھا.. بیتے ہوئے تمام لمحوں سے غافل اور

لاپروا.. میرے لیے یہی لمحہ حقیقت تھا باقی جو گزرا محض سراب تھا..اور میں سمجھتا تھا کہ یہ ہمیشہ رہے گا.. یہیں تمہارے گا.. یہ سرحدیں' یہ نظریے' عقیدے کی پختگی.. تا ابد یونہی اٹل اور قائم رہیں گے' اسی ایک لمحے کا تسلسل جاری رہے گا لیکن ان مہانوں کو دیکھ کر لمحہ' موجود میں دراڑیں پڑتی تھیں' خدشہ بڑھتا تھا کہ یہ سب کچھ بھی بہاؤ میں بہہ جائے گا لیکن دریا کے اس پونگ نے.. بھورے بالوں اور لشکیلے بدنوں والے مہانوں نے البتہ یہیں رہنا تھا.. یہ کہیں سے نہیں آئے تھے اور انہوں نے کہیں نہیں جانا تھا.. سندھ کے پانیوں کی آخری بوند تک یہیں رہنا تھا..ہاں اگر آخری بوند بھی خشک ہو جاتی ہے تو پھر ان کی کوکھ میں گرنے والی انسانی بوند بھی ثمر آور نہیں ہو گی.. ہر شے آنی جانی تھی' بس یہی لوگ ابد تھے..

اوپر غازی گھاٹ کے پل پر رُکی ٹریفک بے چین اور پر شور ہوتی تھی۔ پریشر ہارنز اور بار بار تھمتے پھر سے سٹارٹ ہوتے انجنوں کی آوازیں نیچے اتر کر انڈس کوئین کے عرشے تک آتے آتے مدھم ہو جاتی تھیں ہوا ان کے شور کو بہالے جاتی تھی اور ان کا وجود ایک شائبہ ایک شبہ لگنے لگتا تھا۔

اس نے ریلنگ پر جمی مٹھی کو کھولا تو پھر اسے ایک دھچکا سا لگا.. انڈس کوئین کے زمانے سے گھگھیائے ہوئے بھونپو میں سے روانگی کی کوئی اطلاع تو برآمد نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی برسوں کی بے آباد کھنڈر سکونت کو ترک کر کے کھسکتی ہوئی مہانوں کے چھپروں کو روندتی ان کی کشتیوں کو اپنے وجود سے دھکیلتی سندھ میں اترنے کو تو نہ تھی.. تو پھر کیا تھا کہ اس نے ریلنگ پر کھلی مٹھی کو پھر سے مضبوطی سے بند کر لیا اور لمحہ' موجود کی دہشت میں آ گیا..

ایک جنگجو کو اگر میدانِ جنگ کی بجائے موت بستر میں آگھیرے تو اس سے بڑی حرماں نصیبی اور کیا ہو گی.. ''انڈس کوئین'' ایک ایسا ہی جنگجو تھا جو برس ہا برس تک میدانِ سندھ میں رہا اور موت نے اسے خشکی پر آگھیرا تھا.. اپنی تضحیک کی تاب نہ لا کر... کھیتوں کے اس بستر میں مرنا نہیں چاہتا تھا اور اپنے میدان کی جانب جانے کی خواہش میں شاید ہولے ہولے جی اٹھتا تھا.. آہستہ آہستہ متحرک ہوتا تھا..

اور اس کے تحرک کے ساتھ اس میں سوار مسافروں میں بھی جان پڑتی تھی..

انڈس کوئین میں جمع چیدہ اور منتخب مسافروں کے قدموں تلے' ان کے فل بوٹس

اور اونچی ایڑھی کی گرگابیوں تلے عرشے کے تختے نئے نکور اور اتنے پالش شدہ تھے کہ ان میں ان پر کھڑی پُر تکبر میم صاحبان کے انڈرویئر بھی عکس ہوتے تھے۔ انجن رُوم کی گڑگڑاہٹ اوپر عرشے تک آتے آتے اتنی مدھم ہو جاتی تھی کہ ان کی راج گفتگو میں مخل نہ ہوتی تھی.. ریلنگ کے ساتھ آویزاں لائف جیکٹس پر "انڈس کوئین" کے حرف شوخ اور واضح تھے..

برانڈی اور سکاچ کی گہری تہذیب یافتہ مہک عرشے کے چوبی پالش شدہ تختوں اور مسافروں کے بدن میں سرایت کرتی تھی۔

وی آئی پی لاؤنج کے صوفوں میں دھنسے پولیٹیکل ایجنٹ اور کونے میں ٹیبل لیمپ کے برابر اکڑوں بیٹھے راج دلارے ابھی حال ہی میں کچلی گئی بغاوت کے تذکرے کرتے تھے اور لیٹیوز کے مظالم پر نفرین بھیجتے تھے۔ ان میں جو نیٹو تھے وہ جھک کر پولیٹیکل ایجنٹ کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلاتے تھے اور آیندہ بھی کسی غدر کے دوران اپنی مکمل حمایت کے وعدے کرتے تھے.. عرشے کے کسی اور حصے میں بلوچ سرداروں کی سرکوبی کرنے یا انہیں خریدنے کے منصوبوں پر پائپ کے کش لگاتے برانڈی کے گھونٹ بھرتے صاحب بہادر' ان لوگوں کے ساتھ مشورے کرتے تھے جو اطاعت گزار ہو چکے تھے..

لاٹ صاحبان اور میم صاحبان کی حضوری کی خواہش میں وفادار بلوچ فیوڈل تاک میں رہتے تھے کہ کب نظر کرم ان کی جانب اٹھے.. اگر کوئی ایسی نظر اٹھتی تھی تو وہ بڑے گھیرے کی شلواریں سنبھالتے' ازار بند اڑستے' اپنی جہازی پگڑیوں کو دونوں ہاتھوں سے گرنے سے بچاتے لوٹ پوٹ ہوتے اس آس میں آگے بڑھتے کہ شاید یہ میم صاحب مجھے اپنے پوڈل یا سکاٹش ٹیریئر کو پچکارنے کی اجازت مرحمت فرمادیں' اسے نہلانے کا مقدس فریضہ مجھے سونپ دیں۔ یا لاٹ صاحب مجھے برانڈی کا ایک پیگ بنانے کی سعادت بخش دیں... اور ان کی گھنی مونچھوں تلے کاسہ لیسی سجی تھی اور عنایت شدہ جاگیروں کے چھن جانے کا خدشہ منڈلاتا تھا۔

ان وقتوں پر راج کرتی "انڈس کوئین" سندھ کے سینے پر گورا لوگ کی برتری اور کالا لوگ کی کمتری کے بوجھ کے باوجود تیرتی تھی۔

تو اس وقت... برتری اور کمتری کے گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی ایک ایسا لمحہ' ایسا

دن... ایسی دوپہر آئے گی... اس لائف جیکٹ اور ہیملٹن ونڈسر کے یارڈ میں ڈھلے گرانڈیل وہیل کی آہنی توانائی کو خدشہ بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی دوپہر آئے گی.. ایک وقت آئے گا جب یہ رائل سٹیم شپ غازی گھاٹ کے نیچے کھیتوں میں کھنڈر ہو گا... ایسے ٹیٹوز آئیں گے جو وہیل کو بیلنے کے طور پر استعمال کر کے گنے کے پھوک کے ڈھیر یہاں چھوڑ جائیں گے.

کموڈ کے گرد کوئی چار دیواری نہ ہو گی..

لائف جیکٹ پر سے "انڈس" کے حرف ہوائیں اڑا دیں گی۔

ونیشن بلائنڈز کے پیچھے انہی صوفوں کے... جن پر راج کی اہم ترین پشتوں نے آرام کیا تھا' بسرام کیا تھا.. سپرنگ ساکت زنگ آلود بگولے ہوں گے.. اور جس لیمپ کی روشنی میں وہ اپنے آگے جھکے سرداروں کے نام جاگیریں کرتے تھے وہ خاک میں اوندھا اور اندھا پڑا ہو گا..

ایک جنگجو کی مانند... ایک سٹیم شپ کے لیے اس سے بڑی ہتک اور کیا ہو گی کہ وہ نہ تو پانی میں ڈوبے اور نہ اپنی عمر پوری کر کے کسی شپ بریکنگ یارڈ میں ہتھوڑوں تلے آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے بلکہ... پانی سے دور خشکی پر بے آسرا اور گمنام پڑا رہے... ایک ایسا شخص جس نے بھرپور زندگی بسر کی ہو اور پھر وہ بیکار ہو کر کھنڈر ایسا ہو کہ کہیں دفن ہونے کی بجائے صحرا کی کھلی فضا میں پنجر ہوتا جائے.. ایک شخص کی' ایک سٹیم شپ کی ہتک اور کیا ہو گی۔

کسی پاؤں کے دھرنے اور اس کے بوجھ سے اس کے عقب میں جو تختے تھے ان کے چرچرانے نے اطلاع کی کہ کوئی ہے..

"سائیں..."

اس نے فوراً ریلنگ پر جمی ہتھیلی کھول دی اور مڑ کر دیکھا۔

سرور تھا۔

صرف ایک دھجی سی لنگی میں... اس کا سیاہ چھریرا منحنی بدن.. اور یہ لنگی بھی غیر ضروری تھی وہ اس کے بغیر زیادہ قدرتی لگتا' جیسے کسی جانور کے نچلے دھڑ کو ڈھانپ دیا جائے.. کالے سیاہ جثے میں صرف اس کی آنکھیں تھیں' جو دو چنگاریوں کی طرح بھڑکتی اور پھڑپھڑاتی تھیں۔

خاور نے اس عجیب سے جانور کو بہت غور سے دیکھا اور اسے ایک جھرجھری سی آئی.. ایک انجانا خوف اس کے اندر ایک بگولے کی طرح اٹھا اور اس کی آنتوں کے گرد لپٹ کر ان کا دم گھونٹنے لگا.. اس جانور کی قربت میں اسے ایک آبی تنہائی میں اترنا تھا.. اس کے ماماں جعفر اور گھر والی پکھی کے ہمراہ دن اور رات کرنے تھے۔ وہ سیاہ جونکوں کی طرح لچکیلے اور بدہیئت بدصورتی والے بدن تھے.. اس خیال نے اسے بہت بے آرام کیا.. یہ بے جواز سفر اب بھی موقوف ہو سکتا تھا.. ان لوگوں کی طویل رفاقت قبول نہ ہوتی تھی۔

"سائیں.. آپ کا کل مال اسباب.. بھانڈا انڈر اور کھان پین کشتی میں لگا کھڑا ہے.. آپ آجاؤ تو نکلتے ہیں..."

"نکلتے ہیں؟"

"خواجہ خضر سائیں کے سہارے چلتے ہیں ناں ادھر سے... سامان لگا کھڑا ہے"

"انڈس کوئین" کی بوسیدگی بھری وقت کی ماری موجودگی میں اس نے ایک گہرا سانس بھرا... یہاں اب اور کوئی سانس نہ تھا.. برانڈی کی مہک نہیں تھی. دریا کی نیم گرم اور نم ہوا تھی جس میں چھپروں کے سرکنڈوں کی خشکی تیرتی آتی تھی..

"چلیں سائیں.."

"یہ... یہاں کب سے ہے سرور؟"

"یہ تو..." سرور مخمصے میں پڑ گیا.. ران پر دیر تک کھجلی کرتا رہا" مجھے تو نہیں یاد سائیں.. پر میرا باپ تھا ناں سائیں.. وہ کہتا تھا کہ ہم پُونگ لوگ ہیں.. پُونگ تو سمجھتے ہو ناں سائیں.. مچھلی کے بچے... ہم لوگ خشکی پر جتنی دیر ٹھہریں ناں تو اتنے ہمارے ساہ کم ہو جاتے ہیں.. تو وہ جو میرا باپ تھا ناں تو وہ بمبئی پانیوں میں رہتا تھا' خشکی پر آتا تھا تو صرف نانڈے کاٹنے کے لیے اور بوٹی پینے کے لیے.. تو وہ بولا کرتا تھا یہ کشتی تو تب سے ادھر برباد کھڑی ہے جب وہ ابھی گیلا گیلا اپنی ماں سے باہر آیا تھا.."

"اس نے یا کسی اور نے اسے اس زمانے میں نہیں دیکھا جب یہ پانیوں میں چلتی تھی؟"

"نہیں سائیں.. یہ تو مدھ قدیم سے ادھر پڑی ہے.. ہم مہانے اس میں قدم نہیں دھرتے.. کبھی کبھار اوپر سے لوگ آتے ہیں. کچھ گنے چوس کر ادھر پھوک ڈھیر کر جاتے